قرآن کریم کی نظر میں مطلوب گفتگو کا معیار

محمد جواد[1]

چکیدہ:

انسان کو دوسری مخلوقات سے ممتاز کرنے والی اہم ترین صلاحیتوں میں سے ایک اظہارِ خیال (بیان) کی صلاحیت ہے۔ قرآن مجید میں اس صلاحیت کو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت قرار دیا گیا ہے، جس کے استعمال کے لیے واضح اصول وآداب بیان کیے گئے ہیں۔ زبان کا صحیح استعمال فرد کو کامیابی اور سعادت کی منزل تک پہنچا سکتا ہے جبکہ اس کا غلط استعمال تباہی کا سبب بن سکتا ہے۔ پیش نظر تحریر میں قرآن مجید میں مذکور مختلف اقسام کے اقوال کا تجزیہ کیا گیا ہے، جن میں قولِ معروف، قولِ سدید، قولِ بلیغ، قولِ کریم، قولِ میسور، قولِ لین، قولِ احسن، فصلِ خطاب اور سلام کے تصورات شامل ہیں۔ یہ تمام اصنافِ کلام مختلف مواقع، مخاطبین کی نفسیات اور مقاصد کے پیش نظر گفتگو کے درست اسلوب، لہجے اور حکمت کی وضاحت کرتی ہیں۔ مقالے میں ان اصناف کی شرعی ولسانی تشریحات پیش کرتے ہوئے عملی زندگی (خصوصاً خاندانی، دعوتی اور معاشرتی روابط) میں ان کے اطلاق کے تربیتی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ تحقیق سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ قرآنی تعلیمات کے مطابق کامیاب اور موثر ابلاغ کے لیے ضروری ہے کہ گفتگو موقع کی مناسبت، نرمی، احترام، وضاحت، اثر آفرینی اور حکمت پر مبنی ہو، اور جہاں گفتگو بے سود ہو وہاں سلام کے ساتھ کنارہ کشی اختیار کرنا بہترین راہ ہے۔

کلیدی الفاظ:

قرآنی ابلاغ، قولِ معروف، قولِ سدید، قولِ بلیغ، قولِ کریم، قولِ لین، آدابِ گفتگو، حکمتِ دعوت

---

[1] دانشجو سطح چہار، مجتمع اموزش عالی ادبیات وفرہنگ شناسی، جامعہ المصطفیٰ العالمیہ، پاکستان

Jawadparvi۱۴@gmail.com

مقدمہ؛

انسان کو جو خاص فضیلتیں حاصل ہیں، ان میں سے ایک بیان (اظہارِ خیال) کی صلاحیت بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ کاارشاد ہے: خَلَقَ الْإِنسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ "(سورۂ رحمن، /۴،۳)"اس نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا۔"

سورۂ بلد (آیت ۹) میں زبان اور دو ہونٹوں کو اللہ کے عطیہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ "کیا (ہم نے انسان کو) ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے؟۔"

انسانی زندگی میں گفتگو اور بات چیت کی بڑی اہمیت ہے۔ انسان کو شب و روز دوسرے انسانوں سے تبادلۂ خیال کا موقع ملتا رہتا ہے۔ قرآن و حدیث میں گفتگو کے اصول و آداب سکھا دیے گئے ہیں۔ زبان کی حفاظت اور اس کا صحیح استعمال فرد کو جنت کا حقدار بنا دیتا ہے جب کہ اس کے غلط استعمال سے جہنم کا مستحق قرار پا سکتا ہے۔ انسان کے قول و فعل کو کراماً کاتبین کے ذریعے محفوظ کیا جا رہا ہے۔ سورۂ ق (آیت: ۱۸) میں کہا گیا: مَا يَلْفِظُ مِن قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ "سورۂ ق (آیت:۱۸) کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لیے ایک حاضر باش نگران موجود نہ ہو۔" نبی اکرم ﷺ نے یہ اصول سمجھا دیا ہے کہ " مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَ الْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْراً أَوْ لِيَسْكُتْ۔" "جو کوئی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتا ہو، اسے چاہیے کہ یا تو بھلی بات کہے یا پھر خاموش رہے۔"
(مجلسی، بحار الانوار، ج ۴۴، ص ۶۱)

قرآن مجید میں زبان کے استعمال کے حوالے سے متنوع اصول بیان ہوئے ہیں۔ مختلف مواقع کے لیے مختلف لہجے اور اسلوب سکھائے گئے ہیں۔ درست لہجوں کی بھی وضاحت کی گئی ہے اور بعض ناپسندیدہ طریقوں کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔ اس تحریر میں موضوع کے صرف تربیتی پہلوؤں کا احاطہ کیا جا رہا ہے۔

گفتگو کا معیار مطلوب قرآن کی نظر میں؛

قول معروف (اچھی بات)؛

لفظ "معروف" قرآن مجید میں تقریباً پینتیس بار مختلف شکلوں اور تعبیروں کے ساتھ استعمال ہوا ہے لیکن "قولِ معروف" کا ذکر قرآن مجید کی ان چھ آیات میں ہوا ہے۔(البقرۃ: ۲۳۵، ۲۶۳، النساء: ۵، ۸، الاحزاب: ۳۲، محمد: ۲۱)۔ مثلًا: وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا (سورۂ نساء، ۵)"اور ان سے معروف طریقے سے بات کرو۔" معروف "عُرف" سے بنا ہے جس کے معنی جاننے اور پہچاننے کے ہیں۔ معروف جانی پہچانی چیز کو کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں نیکی اور بھلائی کو معروف کہا گیا ہے، اس لیے کہ نیکی یا بھلائی انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ قرآن میں "معروف" کا لفظ "منکر" کے مقابل استعمال ہوا ہے۔ یعنی معروف سے مراد وہ قول و فعل ہے جو نیک ہو، جسے عقل پسند کرے اور شرع بھی اس کی تصدیق کرے۔ نیز "قول معروف" اس قول کو کہتے ہیں جو اپنے اصل مقام میں واضح، ممتاز اور شناختہ ہو، جہاں تک کہ عقلِ سلیم اسے قبول کرے اور نقلِ معتبر بھی اسے عقل کے موافق اور حق کا تابع تسلیم کرے۔

قولِ معروف سے مراد اچھی بات ہے۔ ایسی بات جو درست ہو، معقول ہو، جسے انسانی ضمیر صحیح سمجھتا ہو، اور ایسی گفتگو جو نیک ہو۔ جن مواقع پر جھنجھلاہٹ پیدا ہونے یا ناگواری کا احساس پیدا ہونے کا امکان ہو، ان مواقع پر حلم و بردباری کے ساتھ اچھے طریقے سے بات بتا دینے کو بھی قولِ معروف کہا گیا ہے۔ وراثت کی تقسیم کے وقت اگر کچھ رشتہ دار، غرباء مساکین و یتیم آجائیں تو انھیں جھڑ کا نہ جائے، بلکہ اچھے انداز سے ان سے بات کی جائے۔ ان آیات میں ایک مقام (البقرۃ: ۲۶۳) پر معروف کے ساتھ مغفرت کا بھی ذکر کیا گیا ہے: (قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّن صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذًى وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ) اس میں انفاق کرنے کے بعد احسان جتانے کو معیوب قرار دیا گیا ہے اور دلداری کی بات اور در گزر یا معذرت کی بات کو اس سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ احسان جتانا دلآزاری ہے جب کہ انفاق کا تقاضا دلداری ہے۔ تفسیر کی کتابوں کی طرف رجوع کرنے سے قول معروف کے مختلف معانی مختلف مناسبتوں کے اعتبار سے بنتے ہیں مثلاً سورۂ احزاب (آیت ۳۲) میں امہات المؤمنین کو دی گئی ہدایات کی روشنی میں معروف سے مراد ضرورت کی بات چیت ہے جس میں نہ نزاکت ہو اور نہ تلخی۔ سورۂ نساء (آیت ۵) میں وارد "قولِ معروف" کو "نیک ہدایت کرنے" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۂ محمد (آیت: ۲۱) میں وارد "قولِ معروف" کو "سمع وطاعت کا قول" مراد لیا گیا ہے جسے سورۂ نور (آیت: ۵۱) میں قولِ مومنین بھی کہا گیا ہے۔

لہٰذا قولِ معروف کا تقاضا یہ ہے کہ ہم زبان کا محتاط استعمال کریں۔ گفتگو کا اسلوب و لہجہ شائستہ و باوقار ہو۔ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ گفتگو ضرورت سے کم ہو اور نہ ضرورت سے زیادہ ہو۔ ہماری گفتگو حلم و بردباری کی آئینہ دار ہو۔ کسی کی نصیحت مقصود ہو تو اس

کی تحقیر نہ ہو۔اگر کسی وقت کسی سے گفتگو مناسب محسوس نہ ہو تو سلام کے ساتھ معذرت کرلی جائے۔ ناگوار مواقع پر ضبطِ نفس کے ساتھ ضبط کلام کا بھی مظاہرہ ہو۔

قولِ معروف صرف خاندان تک محدود ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا آغاز خاندان سے ہے اور اسے خاندان کے ماحول سے دوسرے مقامات تک پھیلایا جانا چاہیے۔

قول سدید (سیدھی بات)

"قولِ سدید" کا ذکر قرآن مجید میں دو مرتبہ ہوا ہے۔ (النساء: ۹، الاحزاب: ۷۰)۔ سورۂ نساء کی آیت میں وراثت کی تقسیم کے موقع پر یتیموں کی دلداری کے حوالے سے قول سدید کی تلقین کی گئی ہے۔ جب کہ سورۂ احزاب کی آیت میں مسلمانوں کو تقویٰ کی تلقین کے بعد قولِ سدید کا حکم دیا گیا ہے جس کے التزام کا انعام اعمال کی درستی اور گناہوں کی معافی قرار دیا گیا ہے۔ سورۂ احزاب کی یہ آیت اور اس کے بعد والی آیت خطبۂ نکاح میں بھی شامل ہے۔ قولِ سدید سے مراد سیدھی بات، راستی کی بات، جچی تلی بات، سچی بات، معقول بات، ٹھیک بات، صاف بات، پکّی بات اور حق پر مبنی بات، لیے جاتے ہیں۔ سورۂ احزاب کی آیت ملاحظہ ہو:

" يا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا " (احزاب، ۷۰) "اے ایمان لانے والو، اللہ سے ڈرو اور ٹھیک بات کیا کرو"

قول سدید کی تفسیر بعض نے صدق کے ساتھ کی ہے، بعض نے مستقیم، اور بعض نے صواب، وغیرہ سے کی۔ ابن کثیر نے سب کو نقل کرکے فرمایا کہ سب حق پر ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ قرآن کریم نے اس جگہ صدق یا مستقیم وغیرہ کے الفاظ چھوڑ کر سدید کا لفظ اختیار فرمایا، کیوں کہ لفظ سدید ان تمام اوصاف کا جامع ہے۔ اسی لیے کاشفی نے روح البیان میں فرمایا کہ قولِ سدید وہ قول ہے جو سچا ہو، جھوٹ کا اس میں شائبہ نہ ہو، صواب ہو جس میں خطا کا شائبہ نہ ہو، ٹھیک بات ہو، ہزل یعنی مذاق و دل لگی نہ ہو، نرم کلام ہو دل خراش نہ ہو۔

خطبہ نکاح میں قولِ سدید کی تلقین میاں بیوی کے لیے اہم ہدایت ہے۔ میاں بیوی کو زندگی بھر ایک دوسرے کے ساتھ رہنا ہے، گفت و شنید کرنا ہے۔ باہمی مشاورت بھی کرنی ہے۔ اکثر یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ میاں بیوی میں ناچاقی زبان کے غلط استعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کا مذاق اڑانا، تحقیر کرنا، طعنے کسنا، برا بھلا کہنا، ناشکری کرنا، احسان جتانا، وغیرہ امور گھریلو ماحول میں بدمزگی پیدا کرتے ہیں، ازدواجی تعلق کو کم زور کرتے ہیں اور رشتہ ٹوٹنے تک کی نوبت آجاتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے

خوشگوار ازدواجی زندگی کے لیے قولِ سدید کا حکم دیا ہے۔ زوجین کے مابین قولِ سدید یہ ہے کہ دونوں کی گفتگو میں اعتدال ہو، احتیاط ہو، محبت ہو، خیر خواہی کا جذبہ ہو۔ ایسی گفتگو سے احتراز ہو جو خلاف حقیقت ہو یا باعث نزاع ہو۔ مختصر یہ کہ قولِ سدید سے مراد یہ ہے کہ ہماری گفتگو واضح ہو، درست ہو۔ ہم پہلے تولیں پھر بولیں، اور مبہم گفتگو سے احتراز کریں۔

قول بلیغ (موثر بات)

"قولِ بلیغ" کا ذکر قرآن مجید میں کچھ اس طرح ہوا ہے۔" أُولَئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُل لَّهُمْ فِي أَنفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا" (نساء:٦٣)"اللہ جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے، ان سے تعرض مت کرو، انھیں سمجھاؤ اور ایسی نصیحت کرو جو ان کے دلوں میں اتر جائے۔"

قولِ بلیغ سے مراد ایسی گفتگو ہے جو دلوں میں اتر جائے اور اثر کر جائے۔ بلاغ اور تبلیغ بات پہنچا دینے کو کہا جاتا ہے۔ فصاحت اور بلاغت کے الفاظ بھی اردو میں معروف اور مستعمل ہیں۔ قولِ بلیغ معیاری اور موئثر گفتگو کو کہا جاتا ہے۔ حضور ﷺ کو سورۂ نساء کی اس آیت میں ان منافقین کو قولِ بلیغ کے ذریعے وعظ و نصیحت کا حکم دیا گیا ہے جو اللہ اور رسول کی طرف دعوت دیے جانے پر آپ کے پاس آنے سے کتراتے تھے۔ یہاں قولِ بلیغ کا پس منظر سمجھنے کے لیے اس بات پر غور کرنا کافی ہوگا کہ جن لوگوں میں نفاق کا مرض ہو اور جو دوہری شناخت لیے پھر رہے ہوں، ان کے لیے محض قولِ معروف یا قولِ سدید ناکافی ہوگا، بلکہ ان کے لیے ایسی موئثر گفتگو کے ذریعے نصیحت ضروری ہے جو ان پر اثر ڈال سکے اور وہ خود پر غور کرنے کے لیے آمادہ ہو سکیں۔ پس قولِ بلیغ کا استعمال ہر اس موقع پر ضروری ہے جب سامعین کے دلوں پر اثر ڈالنا مقصود ہو۔ اسی لیے فصاحت و بلاغت کو خطابت کا ایک لازمی حصہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ اصول بھی معروف ہے کہ لوگوں سے ان کے فہم و فراست کے مطابق بات کی جائے۔ مخاطبین اگر اہل علم ہوں تو ان کے روبرو عامیانہ گفتگو ناکافی ہو گی۔ ان کے روبرو علمی گفتگو ہی قولِ بلیغ ہی ہوگا۔

قول کریم (عزت واحترام والی بات)

"قولِ کریم" کا ذکر قرآن مجید میں ہوا ہے۔: وَقُل لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا (سورۂ بنی اسرائیل ا:٢٣)"ان سے احترام کے ساتھ بات کرو۔"

یہ فقرہ اُس آیت کا حصہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کی تلقین کے معاً بعد والدین کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنے کی نصیحت کی ہے۔ اس آیت میں مزید یہ ہدایت دی گئی ہے کہ اگر ان میں کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو جائیں تو انھیں اف تک نہ کہا

جائے، نہ انھیں جھڑک کر جواب دیا جائے بلکہ ان سے احترام کے ساتھ گفتگو کی جائے۔ قولِ کریم کا ترجمہ مفسرین نے احترام، ادب، عزت، تعظیم، کرم والی بات، سعادت مندانہ بات، شریفانہ بات، نرم بات، وغیرہ الفاظ سے کیا ہے۔ قول کریم میں تواضع، عاجزی، فروتنی و خاکساری کا مفہوم شامل ہے۔ اسی آیت میں والدین کو اُف تک نہ کہنے کی تلقین بھی کی گئی ہے، جو اولاد کی بے زاری اور والدین کی دلآزاری کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے برعکس اولاد کو عزت و احترام سکھایا گیا ہے۔ اگلی آیت میں سکھائی گئی دعا میں والدین کے احسانات اور اولاد کے تئیں ان کے مربیانہ رول کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ ان خدمات کا کم از کم صلہ جو اولاد اپنے والدین کو دے سکتے ہیں وہ ادب و احترام کی گفتگو ہے۔

قرآن کی زبان میں قولِ کریم سے مراد ایسی گفتگو ہے جس میں ادب و احترام کا جذبہ شامل ہو۔ قولِ کریم کے اصل حقدار والدین ہی ہیں، لیکن ان کے ساتھ ہمارے اساتذہ، ہمارے اکابر، ہمارے ذمہ داران، بزرگ احباب سب اس زمرے میں شامل ہیں۔ اس لیے کہ حضور اکرم ﷺ نے اس شخص کو ملت سے خارج قرار دیا ہے جو چھوٹوں سے شفقت اور بڑوں کی توقیر نہ کرے۔ ''لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيرَنَا وَ لَمْ يُوَقِّرْ كَبِيرَنَا.'' (الكافي: ج٢ ،ص١٦٥، ح٢)۔

قول میسور (آسان بات)

''قولِ میسور'' کا ذکر قرآن مجید کی سورۂ بنی اسرائیل کی آیت: ۲۸ میں ہوا ہے: ''وَإِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِّن رَّبِّكَ تَرْجُوهَا فَقُل لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُورًا'' (بنی اسرائیل:۲۸)اور ان سے (یعنی حاجت مند رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں سے) تمھیں کترانا ہو، اس بنا پر کہ ابھی تم اللہ کی اس رحمت کو جس کے تم امیدوار ہو، تلاش کر رہے ہو، تو انھیں نرم جواب دے دو۔''

یہ آیت سورہ بنی اسرائیل کی ان آیات کا تسلسل ہے جن میں عبادت، والدین کے ساتھ حسن سلوک، رشتہ داروں، مساکین اور مسافروں کے حقوق کی ادائیگی، اسراف سے اجتناب جیسی متعدد اہم ہدایات دی گئیں ہیں۔ قولِ میسور کا ترجمہ اکثر مفسرین نے ''نرم بات'' سے کیا ہے، بعض نے ''آسان بات'' سے بھی کیا ہے۔ میسور، ''یسر'' سے ہے جس کے معنیٰ آسانی کے ہیں۔ اس سے قبل قولِ معروف کے تحت ناگوار مواقع پر خوش اسلوبی کے ساتھ معذرت کا ذکر گزر چکا ہے۔ اب یہاں ایک دوسری قسم کے موقع پر طرزِ عمل سکھایا گیا ہے کہ ضرورت مندوں کی مدد کے ارادے کے باوجود تعاون کی کوئی سبیل نہ ہو تو کس طریقے سے معذرت کی جائے۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی محتاج اپنی کسی حاجت برآری کے لیے ایسے موقع پر آپ کے پاس آتا ہے جب آپ کے پاس بھی اسے دینے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ آپ کو اللہ تعالیٰ سے اچھے دنوں اور فراخ دستی کی امید تو ہے مگر وقتی طور پر آپ سائل کی حاجت

سے اعراض کرنے پر مجبور ہیں اور چاہتے ہوئے بھی اس کی مدد نہیں کر سکتے۔اگر تمہیں کسی وقت ایسی صورت حال کا سامنا ہو: فَقُل لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُورًاایسے موقع پر سائل کو جھڑ کو نہیں بلکہ متانت اور شرافت سے مناسب الفاظ میں اس سے معذرت کرلو۔‘‘‘

تفسیر نمونہ میں آیت اللہ مکارم شیرازی اسی آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں۔’’**میسور** " (قولِ میسور) مادہ "یُسر " سے ہے جس کے معنی راحت اور آسانی کے ہیں، اور یہاں اس کا وسیع مفہوم ہے جو ہر قسم کی اچھی بات اور احترام و محبت والے برتاؤ کو شامل کرتا ہے۔اس لیے اگر بعض مفسرین نے اسے کسی خاص عبارت سے تفسیر کیا ہے، یااس کے معنی مستقبل میں وعدہ اور قول و قرار کے کیے ہیں، تو یہ سب بیان مصداق کی طرح ہے۔" ہماری قدیم روایات اور معاشرتی اخلاقیات میں ہمارے بزرگوں کی سنت یہ تھی کہ جب در پہ سائل آتا اور ہاتھ خالی ہوتے، تو اس سے نہایت نرمی و شرافت کے ساتھ کہا جاتا تھا۔ بخش دو یا (معاف کر دیجیے) گویا کہتے: تیری آمد نے ہم پر حق ڈال دیا، اب اپنا یہ اخلاقی حق ہمیں معاف فرما، ورنہ ہمارے پاس اس کا صلہ کچھ نہیں۔ اور یہ سب اعتدال کی راہ ہے، کیونکہ ہر نیکی میں میانہ روی ہی کامیابی کی کنجی ہے۔" (مکارم شیرازی، تفسیر نمونہ، ج ۱۲، ص؛۹۰)۔اور شاید یہی اصول معاشرت قول میسور کا ایک خوبصورت پہلو بھی ہو سکتا ہے۔

قول لین (نرم بات)

’’قولِ لین‘‘ کا ذکر قرآن مجید کی سورۂطٰہٰ کی آیت : ۴۴ میں ہوا ہے۔اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ وحضرت ہارون علیہم السلام کو فرعون کے دربار میں نرم گفتگو کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:’’ فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ‘‘(طٰہٰ:۴۴)’’اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا،شاید کے وہ نصیحت قبول کرے یاڈر جائے۔‘‘

فرعون کی سفّاکی، جبر واستبداد اور سرکشی کے مقابلے میں نرم گفتگو کی تلقین بظاہر تعجب خیز نظر آتی ہے۔لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی علّت یہ بیان کی کہ نرم گفتگو کے نتیجے میں تذکّر اور خشیت کا امکان پایا جاتا ہے۔قولِ لین کی تلقین بڑی معنی خیز ہے۔صاحبِ آدمی کے راہ راست پر آنے کی دو ہی شکلیں ہیں۔یا تو وہ تفہیم و تلقین سے مطمئن ہو کر صحیح راستہ اختیار کرلیتا ہے، یا پھر برے انجام سے ڈر کر سیدھا ہو جاتا ہے۔

تفسیر نمونہ میں اسی آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ’’ قولِ لین (نرم گفتار) کا اپنا ایک خاص تاثر اور نفاذ ہوتا ہے،اور یہ مخاطب پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔اسی لیے حضرت موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون (علیہما السلام) کو تاکید کی گئی کہ اگر تم فرعون کے سامنے نرم اور ملائم لہجہ

اختیار کروگے، اور ساتھ ہی حق بات کو صراحت اور قاطعیت کے ساتھ پیش کروگے، تو اس کے تین احتمالات ہیں: پہلا احتمال یہ ہے کہ وہ تمھاری منطقی دلائل کو دل سے قبول کرلے اور ایمان لے آئے۔ دوسرا احتمال یہ کہ کم از کم اللہ کے عذاب کے خوف سے سرِ تسلیم خم کردے اور تمھاری مخالفت نہ کرے۔ تیسرا احتمال یہ کہ نہ تو وہ نصیحت قبول کرے اور نہ ہی خدا سے ڈرے، بلکہ مخالفت کا راستہ اختیار کرلے ــــ ایسی صورت میں اس پر حجت تمام ہو جائے گی۔ بہر حال، اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نرمی اور ملائمت سے کام لینا بے فائدہ نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ بعض اوقات کوئی محبت آمیز پروگرام کسی شخص کے تاریک دل پر اثر نہیں کرتا اور آدمی صرف سختی کے راستے سے ہی اس تک پہنچ سکتا ہے۔ لیکن یہ کلی اصول نہیں ہے، اور نہ ہی آغازِ کار کے لیے یہ طریقہ ہے۔ ابتدائی اور بنیادی طریقہ محبت اور نرمی ہی ہے اور یہی وہ سبق ہے جو زیرِ بحث آیت ہمیں عطا کرتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض روایات میں آتا ہے: یہاں تک کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو حکم دیا گیا تھا کہ فرعون کو اس کے بہترین نام سے پکاریں، شاید اس طرح اس کے تاریک دل پر کوئی اثر پڑ جائے۔" (مکارم شیرازی، تفسیر نمونہ، ج ۱۳، ص:۲۰۹-۲۱۲)۔

حق کی دعوت بہر حال نرمی کے ساتھ دی جائے تو اس کی تاثیر زیادہ ہوتی ہے۔ سخت سے سخت حالات میں بھی ان (انبیا) کا طرزِ خطاب اور اندازِ جواب نہایت ہی نرم، موثر اور ہم دردانہ رہا ہے۔ بہر حال فرعون کی سختی کا جواب سختی سے نہیں بلکہ نرمی سے دیے جانے کا حکم اسلامی مزاج کا آئینہ دار ہے۔

اسلام کے داعی حضرات کو بالخصوص قولِ لین کے ذریعے گفتگو کرنی چاہیے، جو اسلام کے نمائندے بن کر انسانوں کو اللہ کی طرف دعوت دینے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ نرم لہجہ دعوتِ حق قبول کرنے کے لیے ماحول کو سازگار بناتا ہے۔ بات صحیح ہو، لیکن انداز کرخت ہو تو مدعو قریب آنے کے بجائے متنفر ہو سکتا ہے۔ حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ مخاطب کی عزتِ نفس کا خیال کرتے ہوئے نرم لہجہ اختیار کیا جائے۔ نرم گوئی دلوں کو فتح کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔

قولِ احسن (بہترین بات)

سورۂ بقرۃ، آیت ۸۳ میں یہ ہدایت دی گئی ہے: وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا "لوگوں سے بھلی بات کہو۔" (زمر: ۲۳) میں قرآن مجید کو "احسن الحدیث" (بہترین بات) کہا گیا ہے اسی طرح سورۂ بنی اسرائیل (آیت: ۵۳) میں کہا گیا ہے: وَقُل لِّعِبَادِی يَقُولُوا الَّتِی هِی أَحْسَنُ "اور اے محمد، میرے بندوں سے کہہ دو کہ زبان سے وہ بات نکالا کریں جو بہترین ہو۔" ان حوالوں سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ بہترین بات قرآن مجید کی بات ہے۔ بہترین بات لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دینے کی گفتگو ہے۔ قولِ احسن یا قولِ حسن (اچھی بات) یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ خیر و بھلائی کی گفتگو کی جائے۔ امام حسن عسکری علیہ السلام (وَ قُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا) کی تفسیر میں فرماتے ہیں: " قُولُوا لِلنّاسِ كُلِّهِمْ حُسْنا مُؤْمِنِهِمْ وَ مُخالِفِهِمْ، اَمَّا الْمُؤْمِنونَ فَيَبْسُطُ لَهُمْ وَجْهَهُ وَ اَمَّا الْمُخالِفونَ فَيُكَلِّمُهُمْ بِالْمُداراةِ لاِجْتِذابِهِمْ اِلَى الْاِيمانِ. فَاِنِ اسْتَتَرَ مِنْ ذٰلِكَ بِكَفِّ شُرورِهِمْ عَنْ نَفْسِهِ وَ عَنْ اِخْوانِهِ الْمُؤْمِنِين" "یعنی تمام لوگوں سے، خواہ وہ مومن ہوں یا مخالف، اچھی اور نرم زبان سے بات کرو۔ مومن تو اپنے ہم مسلک بھائیوں سے خوش روئی اور خندہ پیشانی سے پیش آتا ہے، اور مخالفین کے ساتھ نرمی اور مدارا سے گفتگو کرتا ہے تاکہ وہ ایمان کی طرف راغب ہو جائیں۔ اور اگر وہ ایمان بھی نہ لائیں، تب بھی اس اخلاقی رویّے کے ذریعے وہ اپنے خلاف اور اپنے مومن بھائیوں کے خلاف ان کی طرف سے ہونے والی شرارتوں اور برائیوں سے بچ جاتا ہے۔" (محدث نوری، مستدرک الوسائل، ج ۱۲، ص ۲۶۱)

پس سب سے بہترین بات قرآن مجید کی بات ہے۔ قرآن کی طرف لوگوں کو دعوت دینا اور قرآن کے اوامر کا حکم دینا بہترین بات ہے۔ ہر بندۂ مؤمن کو اپنی استطاعت کی حد تک دین کی دعوت اور اصلاح امت کا کام انجام دیتے رہنا چاہیے۔

فصل خطاب (فیصلہ کن بات)

اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی توصیف بیان کرتے ہوئے ان کے "قولِ فصل" کا ذکر کیا ہے:

" وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ" (ص: ۲۰) "ہم نے اس کی سلطنت مضبوط کر دی تھی، اس کو حکمت عطا کی تھی اور فیصلہ کن بات کہنے کی صلاحیت بخشی تھی"

"فصل الخطاب" کے معنی فیصلہ کن بات کہنے کی صلاحیت کے ہیں۔ اس کی جامع تشریح تفہیم القرآن میں یوں درج ہے: " یعنی ان کا کلام الجھا ہوا نہ تھا کہ ساری تقریر سن کر بھی آدمی نہ سمجھ سکے کہ کہنا کیا چاہتے ہیں، بلکہ وہ جس معاملہ پر بھی گفتگو کرتے، اس کے تمام بنیادی نکات کو منقح کر کے رکھ دیتے، اور اصل فیصلہ طلب مسئلے کو ٹھیک ٹھیک متعین کر کے اس کا بالکل دو ٹوک جواب دے

دیتے تھے۔ یہ بات کسی شخص کو اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک وہ عقل و فہم اور قادر الکلامی کے اعلیٰ مرتبہ پر پہنچا ہوا نہ ہو۔"

قولِ فصل کی صلاحیت امت کے ان افراد میں پیدا ہونا ضروری ہے، جو لوگوں کے معاملات حل کرنے میں مدد کرتے ہیں، تاکہ وہ برحق فیصلہ اور مناسب رہ نمائی کر سکیں۔ قائدین کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنے اندر تدبر، اصابتِ رائے اور معاملہ فہمی کے ساتھ اظہارِ خیال کی صلاحیت کو بھی بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کریں۔

سلام (کنارہ کشی کی بات)

کبھی ایسا موقع بھی آتا ہے جب خاموشی بہتر ہو جاتی ہے۔ سورۂ فرقان میں عباد الرحمٰن کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا" (الفرقان:۶۳) "اور جاہل اُن کے منہ آئیں تو کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام"

اس فقرے کی تشریح تفسیر نمونہ میں آیت اللہ مکارم شیرازی یوں کرتے ہیں: "یہ سلام (جسے عباد الرحمٰن ادا کرتے ہیں) دراصل بے اعتنائی کے اُس انداز کا نام ہے جو بزرگواری اور شرافت سے عبارت ہے، کسی طرح کے کمزوری پر مبنی نہیں۔ یہ سلام جاہلوں اور کم عقل لوگوں کے مقابلے میں ہتھیار ڈالنے یا بدلہ لینے سے گریز کرنے کی علامت ہے۔ یہ اُن کی بیہودہ گوئی سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے رخصت ہونے کا طریقہ ہے، نہ کہ وہ سلامِ تحیّت جو محبت اور دوستی کے تعلق کا اظہار ہوتا ہے۔ بے شک، عباد الرحمٰن کی عظیم روحانی صفات میں سے ایک خصوصیت اُن کا تحمل اور برداشت ہے۔ جس کے بغیر کوئی انسان بھی عبودیت اور بندگی کے دشوار گزار اور اتار چڑھاؤ سے بھرے راستے کو طے نہیں کر سکتا، خاص طور پر اُن معاشروں میں جہاں فاسد، مفسد، جاہل اور نادان لوگ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ مکارم شیرازی، تفسیر نمونہ، ج۱۵، ص۱۴۹)

یہاں پر جاہل سے مراد اَن پڑھ یا بے علم آدمی نہیں، بلکہ وہ شخص ہے جو جہالت پر اتر آئے اور کسی شریف آدمی سے بدتمیزی کا برتاؤ کرنے لگے۔ رحمان کے بندوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ گالی کا جواب گالی سے اور بہتان کا جواب بہتان سے اور اسی طرح کی ہر بیہودگی کا جواب ویسی ہی بیہودگی سے نہیں دیتے بلکہ جو اُن کے ساتھ یہ رویہ اختیار کرتا ہے وہ اس کو سلام کر کے الگ ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: "وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِينَ (القصص: ۵۵) "اور جب وہ بیہودہ بات سُنتے ہیں تو یہ کہہ کر اُس سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں کہ "ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے، تم کو سلام ہے، ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتے۔" خلاصہ یہ کہ یہ سلام حلم، بردباری اور عالی ظرفی کا آئینہ دار ہے۔

نتیجہ گیری آخر:

قولِ معروف کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم زبان کا محتاط استعمال کریں۔ گفتگو کا اسلوب و لہجہ شائستہ و باوقار ہو۔ کسی کی دلآزاری نہ ہو۔ گفتگو ضرورت سے کم ہو اور نہ ضرورت سے زیادہ ہو۔ ہماری گفتگو حلم و بردباری کی آئینہ دار ہو۔ کسی کی نصیحت مقصود ہو تو اس کی تحقیر نہ ہو۔ اگر کسی وقت کسی سے گفتگو مناسب محسوس نہ ہو تو سلام کے ساتھ معذرت کر لی جائے۔ ناگوار مواقع پر ضبطِ نفس کے ساتھ ضبط کلام کا بھی مظاہرہ ہو۔

قولِ سدید کا اخلاصہ یہ ہے کہ ہماری گفتگو واضح ہو، درست ہو۔ ہم پہلے تولیں پھر بولیں، اور مبہم گفتگو سے احتراز کریں۔

قولِ بلیغ کا استعمال ہر اس موقع پر ضروری ہے جب سامعین کے دلوں پر اثر ڈالنا مقصود ہو۔ اسی لیے فصاحت و بلاغت کو خطابت کا ایک لازمی حصہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ اصول بھی معروف ہے کہ لوگوں سے ان کے فہم و فراست کے مطابق بات کی جائے۔ مخاطبین اگر اہل علم ہوں تو ان کے روبرو عامیانہ گفتگو ناکافی ہو گی۔ ان کے روبرو علمی گفتگو ہی قولِ بلیغ ہی ہو گا۔

قولِ کریم سے مراد ایسی گفتگو ہے جس میں ادب و احترام کا جذبہ شامل ہو۔ قولِ کریم کے اصل حقدار والدین ہی ہیں، لیکن ان کے ساتھ ہمارے اساتذہ، ہمارے اکابر، ہمارے ذمہ داران، بزرگ احباب سب اس زمرے میں شامل ہیں۔ اس لیے کہ حضور اکرم ﷺ نے اس شخص کو ملت سے خارج قرار دیا ہے جو چھوٹوں سے شفقت اور بڑوں کی توقیر نہ کرے۔

قولِ میسور کے مفہوم میں مختصر، سادہ، عامیانہ اور قابلِ فہم گفتگو شامل ہو سکتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے دیے ہوئے اصول "يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا" (آسانی پیدا کرو، مشکل میں مت ڈالو) کا تقاضا بھی یہی ہے کہ لوگوں سے ایسی گفتگو کی جائے جو آسانی سے سمجھی جا سکے

اسلام کے داعی حضرات کو بالخصوص قولِ لین کے ذریعے گفتگو کرنی چاہیے، جو اسلام کے نمائندے بن کر انسانوں کو اللہ کی طرف دعوت دینے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ نرم لہجہ دعوتِ حق قبول کرنے کے لیے ماحول کو سازگار بناتا ہے۔ بات صحیح ہو، لیکن انداز کرخت ہو تو مدعو قریب آنے کے بجائے متنفر ہو سکتا ہے۔ حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ مخاطب کی عزتِ نفس کا خیال کرتے ہوئے نرم لہجہ اختیار کیا جائے۔ نرم گوئی دلوں کو فتح کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔

سب سے بہترین بات قرآن مجید کی بات ہے۔ قرآن کی طرف لوگوں کو دعوت دینااور قرآن کے اوامر کا حکم دینا بہترین بات ہے۔ ہر بندۂ مؤمن کو اپنی استطاعت کی حد تک دین کی دعوت اور اصلاح امت کا کام انجام دیتے رہنا چاہیے۔ قولِ فیصل کی صلاحیت امت کے ان افراد میں پیدا ہونا ضروری ہے، جو لوگوں کے معاملات حل کرنے میں مدد کرتے ہیں، تاکہ وہ برحق فیصلہ اور مناسب رہ نمائی کر سکیں۔ قائدین کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنے اندر تدبر، اصابتِ رائے اور معاملہ فہمی کے ساتھ اظہارِ خیال کی صلاحیت کو بھی بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ جس جگہ گفتگو بے سود ہو اور موقع سنجیدہ فہم وافہام کا نہ ہو، وہاں خاموش ہو جانااور سلام کہہ کر رخصت ہو جانا بہتر ہے۔

منابع و مآخذ:

- قرآن مجید
- نہج البلاغہ

۱. حرّ عاملی, محمد بن حسن، وسائل الشیعہ, قم, مؤسسی آل البیت لاحیاء التراث, ۱۴۰۹ق
۲. طباطبایی، سید محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، قم، اسماعیلیان. ۱۳۷۱ش
۳. طبرسی, حسن بن فضل، مکارم الاخلاق, چاپ ششم, منشورات الشریف الرضی, ۱۳۹۲ق.
۴. کلینی، محمد بن یعقوب،، روضہ الکافی, بیروت، دارالتعارف. ۱۴۰۳ق
۵. مجلسی، محمد باقر، بحارالانوار، چ سوم، تہران، کتابفروشی اسلامیہ. ۱۳۷۰ش
۶. محدث نوری، مستدرک الوسائل، قم: موسسہ آل البیت (ع)، الاحیاآ التراث، ۱۴۰۸ق
۷. محمد محمدی ری شہری، میزان الحکمہ, حمید رضا, دارالحدیث, قم, ۱۳۸۴
۸. مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، ج ۳، ص ۱۵۵، دار الکتب الاسلامیۃ، تہران، ۱۳۷۴ش.
۹. نجفی, محمد حسن، جواہر الکلام, تحقیق محمد قوچانی, المکتب الاسلامیہ, بیتا.